© rasailojaraid.com

از سید قطب شہید

ترجمہ عبدالحمید صدیقی

سفید استعمار کا حشر!

مشہور انگریز فلسفی برٹرنڈ رسل نے کہا ہے:۔

"سفید فام انسان کا دورِ اقتدار اب اپنے حسرت ناک انجام کو پہنچ چکا ہے اس کی قیادت و سیادت قدرت کی کوئی ابدی اور ناقابلِ تغیر سچائی تو نہ تھی جسے دوام نصیب ہوتا مجھے اس بات کا پختہ یقین ہے کہ سفید فام آدمی کو قدرت نے گزشتہ چار صدیوں میں جو زریں مواقع فراہم کیے تھے۔ اب دوبارہ اسے کبھی میسر نہ آئیں گے۔ لے دے کر اب روس کے لیے ہی ایشیا میں اثر و نفوذ کی راہیں کھل کر رہ گئی ہیں۔ ایشیا کے لوگ سرمایہ دارانہ استعمار کی ریشہ دوانیوں کا پوری طرح مزہ چکھ چکے ہیں۔ انہیں کچھ معلوم نہیں کہ اب روسی استعمار ان کا کیا حشر کرے گا۔ عرصہ دراز تک مغربی ممالک کی غلامی میں رہنے کے بعد اب مسلمان سرمایہ دارانہ استعمار سے تو کسی بھلائی کی توقع نہیں رکھتے۔ میرے یہ کہنے کا مقصد ہرگز نہیں کہ اب اس استعمار کی کسی جگہ بھی پذیرائی نہ ہوگی۔ بعض ایشیائی ممالک اپنی اغراض کی خاطر اس کے سایہ عاطفت میں آنے پر مجبور ہوں گے۔ مگر وہ دل سے اسے کبھی اچھا نہ سمجھیں گے۔ چنانچہ اس مجبوری کے تحت بھارت مغرب کے سرمایہ دارانہ ممالک کے ساتھ ربط و ضبط بڑھائے گا اور دنیائے اسلام، یعنی عرب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مصر اور پاکستان اشتراکیت کی آغوش میں پناہ لیں گے۔"

برٹرینڈ رسل نے یہ پیش گوئی ۱۹۵۰ء میں کی تھی جسے بعد کے واقعات نے سچا ثابت کر دکھایا خصوصاً جب سے چین پر اشتراکیت کا تسلط قائم ہوا ہے۔ اس وقت سے ایک ایسی اساس فراہم ہوئی ہے جس پر آنے والے واقعات کی رسل کے اندازے کے مطابق تعمیر ہوتی نظر آتی ہے۔ مگر مجھے یہ کہنے میں قطعاً کوئی تامل نہیں کہ فلسفی کا یہ خیال مادی اسباب کے بالکل سطحی تجزیہ پر مبنی ہے۔ رسل حریت فکر کے لیے کافی مشہور و معروف ہیں۔ لیکن جس ماحول میں انہوں نے پرورش پائی ہے۔ وہ چونکہ سراسر مادی ماحول ہے۔ اس لیے وہ اس کے تہذیبی اثرات کے اپنانے پر مجبور ہیں۔ اور جو خطوط انہوں نے متعین کیے ہیں ان سے ہٹ کر وہ کسی دوسرے انداز پر سوچ نہیں سکتے۔ ان کے لیے اپنے تمدنی حصار کو توڑ کر آزاد ہونا اور پھر پوری دنیا کے حالات کا ایک نئے زاویے سے جائزہ لینا قریب قریب ناممکن ہے۔

یہ مسئلہ جس پر کہ محترم فلسفی نے اظہار خیال کیا ہے گہری توجہ کا محتاج ہے۔ یہ بات تو یقینی ہے کہ سفید فام انسان کی سیادت اور قیادت کا دور اب بیت چکا ہے کیونکہ جس تہذیب کے تفوق کے ساتھ اس کا تسلط وابستہ تھا۔ وہ اب مسمار ہو رہی ہے۔ اس کے پیش نظر جتنے مقاصد اور اس کے سامنے جتنے عزائم تھے وہ اس نے پوری طرح حاصل کر لیے ہیں۔ اب کوئی حسرت باقی نہیں رہی جو اس سے پوری نہ کی ہو۔ نوع انسانی کو زندہ رکھنے اور فوز و فلاح کی راہ پر لگانے کے لیے جن حیات آفریں تصورات اور اقدار کی ضرورت ہے۔ مغربی تہذیب اب ان سے قریب قریب تہی دامن نظر آتی ہے۔

مغرب میں حریت کی وہ جڑیں جو انگلستان سے میگنا کارٹا، انقلاب فرانس اور امریکہ کی تحریک آزادی فرد جسے امریکی تجربہ کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے، کی صورت میں نمودار ہوئیں اب اپنی قوت کھو چکی ہیں۔

تصورات نے ایک خاص دور اور مخصوص حالات میں لوگوں کو بلاشبہ سرگرم عمل کیا۔ مگر ان میں یہ قوت اب موجود نہیں کہ وہ ہر زمانے اور ہر قسم کے حالات میں انسان کو عمل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی قوت فراہم کر سکیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ قوت کے اس دھارے نے جس سرچشمے سے جنم لیا ہے وہ خود اس جوہر سے محروم ہے جو کسی پائیدار اور مستقل نظم اجتماعی کی تشکیل کے لیے ضروری ہے۔ دنیا میں اس نوعیت کا مضبوط نظم اسی وقت معرض وجود میں آتا ہے جب وہ ایمان باللہ کی بنیاد پر قائم کیا جائے اور جب ذات باری کو ساری کائنات کا مرکز و محور تسلیم کر کے اور تعلیمات دینی کی روشنی میں انسان کا اس کائنات میں مرتبہ اور مقام اور اس کے مقاصد متعین کر کے آگے بڑھا جائے۔

جو نظم بھی ان بنیادی اور اساسی تصورات سے الگ ہو کر قائم کیا جائے گا وہ نہایت ناپائیدار اور کمزور ہو گا کیونکہ اس کی جڑیں انسانی فطرت میں پیوست نہ ہونے کی وجہ سے نہایت کھوکھلی ہوں گی۔ اس نظم اور انسانی مزاج میں یکسر مغایرت ہو گی اور اس غیر فطری نظام کو ترقی دینے اور پروان چڑھانے کے لیے غیر فطری وسائل سے کام لینا پڑے گا۔ پھر یہ نظام جن اقدار کو جنم دے گا وہ انسان کی حقیقی ضروریات اور اس کی فطری خواہشات اور تمناؤں کو پورا کرنے میں ہمیشہ ناکام رہیں گی۔ یہ اقدار نہ صرف انسانی عز و شرف کو نقصان پہنچائیں گی بلکہ نوع بشری کو مختلف آلام و مصائب میں گرفتار کر دیں گی۔

ان مادی اقدار نے انسان کو جس طرح ذلیل و رسوا کیا ہے۔ اس کی تفصیل ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ انہوں نے جس تہذیب و تمدن کی صورت گری کی ہے۔ وہ اپنی بنیاد کے اعتبار سے لادینی ہے۔ اس کے اساسی تصورات اور افکار انسان کے حقیقی مزاج اور اس کی اصل ضروریات سے کوئی مطابقت نہیں رکھتے۔ ان اقدار سے انسانیت کے صحیح نشوونما کی امید کرنا محض حکایت تشنہ سراب ہے۔

جس دن سے انسان نے اس تہذیب کو اپنایا ہے وہ اسی روز سے بدبختی کا شکار چلا آرہا ہے۔ مگر اسے اس کی بدنصیبی کے علاوہ کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ ابھی تک یہی سمجھ رہا ہے کہ انسانی فلاح و کامرانی اس تہذیب سے وابستہ رہ کر حاصل کی جا سکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو تہذیب بھی انسان کے صحیح مقصد اور اس کی اصل فطرت کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نظر انداز کر کے پروان چڑھے گی اس کے نشو ونما کے لیے خواہ کتنے ایثار اور محنت سے کام لیا جائے وہ انسان کے لیے کبھی فائدہ مند ثابت نہیں ہوسکتی۔

ہمارے نزدیک کسی تہذیب کے بقا کا معیار یہی ہے کہ وہ انسان کی فطرت سے مطابقت رکھتی ہو اور اسے اچھے اور صالح مقاصد کے لیے سرگرم عمل کرے۔ اس نقطۂ نظر سے ہم جب روس کے اشتراکی نظام کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں انگریزی تمدن، فرانسیسی تمدن، سوئٹزرلینڈ کے تمدن میں کوئی نمایاں فرق محسوس نہیں ہوتا۔ بلکہ ہم تو یہ سمجھتے ہیں۔ روسی تمدن انسان پر جبر واستبداد کے اعتبار سے ان دوسرے تمدنوں سے کہیں زیادہ جابر اور مستبد ہے۔ اس کا تو سارا نظام ہی جبر کے بل بوتے پر چلتا ہے۔ اس کا قیام پولیس کے ظلم واستبداد، عوام کے کشت وخون، تطہیر کے نام پر ہلاکت خیزیوں، جبری کیمپوں کا رہین منت ہے۔ اور قدم قدم پر ایک شعبہ زندگی میں یا پوری زندگی میں انسانی فطرت سے متصادم ہوتا ہے۔

زمان ومکان کی حقیقت کو سمجھنا تو خیر بڑی بات ہے۔ اس نظام کے علمبرداروں نے نفس انسانی کی حقیقت اس کے مزاج اور اس کی تاریخ کو سمجھنے میں بھی سخت ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اس کا سارا فلسفہ اس بنیادی تصور کے گرد گھومتا ہے کہ انسانی افکار واعمال کا سب سے بڑا محرک بھوک اور روٹی کے ایک لقمے پر باہمی آویزش ہے۔ اس کے نزدیک تاریخ کے سارے انقلابات صرف ذرائع پیداوار میں تغیر کا نتیجہ ہیں۔ چنانچہ اس انداز فکر نے انسان کے ان سارے امتیازی خصائص کو کالعدم قرار دیا ہے جو تاریخ بشری اور تاریخ حیوانات کے درمیان وجہ امتیاز ہیں۔ اس نے انسان کے ان اعمال کو بھی بے وزن بنا دیا ہے جن کی رو سے وہ تاریخی ارتقا کے مختلف مراحل میں ہمیشہ ایک فیصلہ کن عامل رہا ہے۔ اس نے انسان کے مستقبل کو ماضی کے تجربات کے بیش قیمت سرمایہ سے یکسر محروم کر دیا ہے

اس کے نزدیک انسان اس طبقاتی آویزش کے نتیجے میں خود بخود فرشتے بن جائیں گے۔ اپنے فرائض خود بخود ادا کرنے لگیں گے اور اپنی محنت کے ثمرات میں سے صرف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اتنا حصہ لینے پر قناعت کریں گے جو ان کی کفالت کر سکے۔ اور یہ طرزِ عمل بغیر کسی خارجی دباؤ کے۔ بغیر کسی حکومت کے۔ بغیر جنت کے کسی لالچ یا دوزخ کے کسی خوف سے اختیار کریں گے۔ ہمیں تو انسان فکر و عمل کے بارے میں یہ خوش کن توقعات عجیب و غریب معلوم ہوتی ہیں خصوصاً جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ یہ ساری تبدیلیاں سرمایہ دارانہ عناصر کو برباد کرنے اور مزدوروں کی قیادت و سیادت قائم کرنے سے خود بخود معرضِ وجود میں آ جائیں گی۔

یہ ہیں وہ جاہلانہ افکار جن پر اشتراکیت کی عمارت تعمیر کی گئی ہے۔ ان حالات میں یہ توقع رکھنا کہ یہ نظام کبھی بھی فلاحِ بشری کی اساس بن سکتا ہے محض خام خیال ہے۔ اس میں بھی سرمایہ دارانہ نظام کی طرح انسانی فطرت کے حقیقی داعیات سے اغماض برتا گیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اشتراکیت کچھ مدت گزرنے کے بعد ہی اپنے پیش کردہ نظریات سے انحراف کرنے پر مجبور ہوئی ہے۔ اور اپنے اس طرزِ عمل کے جواز میں یہ کہتی ہے کہ

"مارکسیت حتمی اور لگے بندھے اصولوں کا نام نہیں۔ اس کے نظریات اور طور طریقے حالات کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔"

انسانی فطرت کے داعیات نے اشتراکیت کے بڑے بڑے اصولوں کا ابطال کر دیا ہے اب دو ہی چیزیں ایسی باقی رہ گئی ہیں جن کے بل بوتے پر اشتراکیت کا نظام قائم ہے۔

- ایک مضبوط حکومت
- اور دوسرے پولیس کی آمریت کے تحت ایک بے حس نظمِ اجتماعی

روسی عوام تو ان دونوں سے دورِ قیصریت سے پوری طرح واقف ہیں۔

مارکسی نظریہ کی رو سے تو ریاست دن بدن کمزور ہونی چاہیے۔ مگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس کا دائرہ کار روز بروز وسیع تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس کی قوت ہر آن بڑھ رہی ہے اور وہ قوم کی ہر شے پر اپنا تسلط جما رہی ہے۔

اسے قسمت کی ستم ظریفی کے علاوہ اور کس بات پر محمول کیا جا سکتا ہے کہ وہ اشتراکیت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جس کا تقاضا ہے مقصود حکومت کے بغیر ایک نظم اجتماعی کا قیام ہے۔ دوسرا ایک ایسی ہمہ گیر کلیت پسند اور مستبد حکومت کے قیام پر منتج ہوتی ہے جس کے تحت فرد، جماعت اور فطرت انسانی کا کوئی وجود باقی نہیں رہا۔

مارکسیت ایک خلاف فطرت اور خلاف عقل مذہب کی حیثیت سے اپنی کوئی نظیر نہیں رکھتی۔ جہاں تک اس کے آمرانہ نظام کا تعلق ہے۔ جو پولیس کی قوت کے بل بوتے پر چل رہا ہے، وہ کوئی نیا نہیں بلکہ زار روس کے عہد سے لوگ اس سے پوری طرح متعارف اور آشنا ہیں۔ ممکن ہے کہ مجبور اور بے بس انسان اسے کچھ مدت تک گوارا کر لیں مگر باشعور افراد اس کی تعدیوں کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتے۔ جو بدنصیب لوگ اس کے نیچے پس رہے ہیں ان پر زندگی عذاب بن کر مسلط ہے۔ کیونکہ یہ نظام ان کی فطرت سے متصادم ہے۔ درآنحالیکہ وہ اس سے قبل قیصر کے استبداد کا مزہ چکھ چکے ہیں۔

عجیب بات ہے کہ محدودے گروہ کا تسلط جن کے ہاتھ میں پورے ملک کے وسائل رزق ہیں اور جس نے بچپن ہی سے نوخیز نسلوں کی تربیت کا ایک خاص نہج پر انتظام کر رکھا ہے اور ان کے ذہنوں میں اشتراکی نصب العین کو راسخ کر دیا ہے۔ وہ بھی لوگوں کو آرام اور سکون کی دولت فراہم نہیں کر سکا۔ اس نظام میں اگرچہ ہر وقت عمل تطہیر ہوتا رہتا ہے لیکن اس کے باوجود یہ نظام زوال پذیر ہے کیونکہ یہ جبر و اکراہ اور انسانی فطرت سے بغاوت پر مبنی ہے۔ لیکن اس نظام کے اس ہمہ گیر تسلط اور اس کے جبر و استبداد کے باوجود عوام اس میں ہمیشہ مائل بہ بغاوت رہتے ہیں۔ اس نظام کی ناکامی کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ یہ خوف و ہراس اور تشدد کے بل پر زندہ ہے۔

چونکہ رسل کی یہ پیشگوئی کس قدر غلط مقدمات پر مبنی ہے۔ فاضل فلسفی نے مادی استبداد کے تنگ دائرے سے نکل کر کچھ سوچا ہی نہیں۔ اس [illegible] تمدن کے افکار میں الجھا ہوا [illegible] کا مسئلہ اتنا سادہ نہیں جتنا اسے سمجھ لیا گیا ہے۔ یہ بڑا پیچیدہ اور الجھا ہوا [illegible]

[illegible]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تصورات اور پورے نظم اجتماعی میں رشد و ہدایت کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ ان تہذیبوں اور فکر و عمل کے ان مختلف نظاموں کے پاس نہیں جو غلط بنیادوں پر قائم ہیں جنھوں نے انسان کا اس کائنات میں صحیح مرتبہ و مقام مشخص کرنے اور اپنے خالق کے ساتھ رشتہ عبودیت استوار کرنے میں ٹھوکر کھائی ہے اور جو انسان کو اس کی اصل حقیقت سے آگاہ کرنے اور اس کے مقاصد متعین کرنے سے عاجز ہیں۔

پورا یورپ اس ناکامی اور نامرادی کا شکار ہے اور اس معاملے میں اہل روس، اہل امریکہ، انگریز، فرانسیسی، سویڈن کے رہنے والے اور مشرق و مغرب میں ان کی پیروی کرنے والے سب برابر ہیں۔

جہاں تک نظم اجتماعی کی اساس اور بنیاد کا تعلق ہے، روس اور امریکہ میں کوئی اختلاف نہیں۔ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ امریکہ میں گرجاؤں کے دروازے لوگوں پر کھلے ہیں اور روس میں ان پر تالے پڑے ہوئے ہیں۔ پھر یہ بات بھی درخور اعتنا نہیں کہ روس میں امریکہ کے مقابلے میں کفر و الحاد پھیلانے کی نہ صرف زیادہ آزادی ہے بلکہ یہ کام حکومت کے فرائض میں داخل ہے۔

یہ تو اختلاف کے خارجی مظاہر ہیں۔ ان سارے ممالک کی اجتماعی زندگی اور ان میں مروجہ خیالات و افکار کی حد تک دونوں میں کافی یگانگت اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے کیونکہ ان کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ پر ایمان اور ایقان نہیں اور نہ اس اساسی تصور کی بنیاد پر حیات انسانی کی تعمیر ہوئی ہے۔ اور نہ انسانیت کے حقیقی اور اصلی جوہر کو پہچان کر اس کے مطابق انسانی زندگی کی غایت متعین کی گئی ہے۔ اس مغربی تہذیب کا اجتماعی ڈھانچہ الحاد کی بنیادوں پر استوار ہے۔ اس لیے یہ اپنے مزاج کے اعتبار سے انسان کے فطری داعیات اور اس کی حقیقی ضروریات کی تکمیل سے قاصر ہے۔

مذہب سے بُعد و بیگانگی وہ بنیادی خرابی ہے جو برٹنڈرسل اور اس طرح کے دوسرے منکرین کے افکار میں پائی جاتی ہے۔ اس خرابی کے بارے میں مغربی تہذیب کے پرستار حکما، یورپ کے تاریخی پس منظر اور اس کے مخصوص ماحول، ماضی میں کلیسا کے جبر و

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

استبداد اور اس کے خلاف جدید نفرت ـــــ الغرض پنج صد سالہ تمدنی اور تہذیبی اثرات سے الگ ہو کر آخر کس طرح سوچ سکتے ہیں؟

عہدِ حاضر کا انسان ایک ایسی تنگ و تاریک فضا میں سانس لے رہا ہے جس میں مغربی تمدن کی روح اور اس کے جاری افکار و نظریات پوری طرح سرایت کیے ہوئے ہیں جو مغرب کے نظامِ اجتماعی پر پوری طرح محیط ہے۔ یہ فضا انسانی روح کی موت ہے۔ اس کے عز و شرف کی موت، انسان کے حقیقی امتیازات کی موت۔ اس فضا میں بے جان اشیاء کی پیداوار حیرت انگیز حد تک بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کی قدر و قیمت میں بے پناہ اضافہ ہو رہا ہے مگر اس کے مقابلے میں ذی روح انسان کی قیمت بالکل گر گئی ہے۔

یہ وہ فضا ہے جس میں انسانیت کا اصل جوہر نیست و نابود ہوا ہے اور اس کی حقیقی نشو و نما کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ انسان کی صنعتی ترقیوں، اس کے علمی اور سائنسی انکشافات اور اشیاء کی کثیر پیداواری اور زود پیداواری کے باوجود انسانیت کو زوال آیا ہے۔ اس کی وجہ ایک ہی ہے کہ جدید تمدن میں انسان کی حقیقی فطرت اور اس کی اصل ضروریات کا پورا پورا خیال نہیں رکھا گیا

یہ بات کسی طرح بھی انسانیت کے لیے مفید نہیں کہ مادی تمدن کی چکا چوند روشنی ہماری نظروں کو اس حد تک خیرہ کر دے کہ ہم ان مصائب سے صرفِ نظر کرنے لگیں، جن سے اس تہذیب نے انسانیت کو دوچار کیا ہے۔ ان آسمانوں میں تیرتے ہوئے راکٹوں اور مصنوعی سیاروں کو دیکھ کر ہمیں اس انحطاط سے تو غافل نہ ہونا چاہیے جس کا انسانیت آج بری طرح شکار ہے۔

اس کائنات میں سب سے زیادہ فضیلت اور شرف کا مالک انسان ہے اور وہ خدا کی اس وسیع و عریض تخلیق میں بنیادی اہمیت کا حامل اور قدرت کے لاتعداد عطیات سے بھرپور فائدہ اٹھانے والا ہے۔ اس کائنات میں جو کچھ بھی موجود ہے وہ اسی کی خدمت اور فائدے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ انسان کا حقیقی جوہر انسانیت ہے اور اسی پر اس کے عروج و زوال کا دار و مدار ہے۔ اس کی روح کی بالیدگی اس کی ترقی کا اصل معیار ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مگر ہم جب تہذیب جدید کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ :۔

○ انسان اپنے جوہر انسانیت اور اپنی حقیقی عظمت کے اعتبار سے روبہ تنزل ہے۔

○ وہ بے حس مشین کا بے بس کل پرزہ بن چکا ہے۔

○ اس کا اخلاق اور اس کی روح برباد ہو چکی ہے۔

○ وہ جنسی تلذذ میں اتنا کھو چکا ہے کہ اس پر حیوانوں کا گمان ہوتا ہے۔

○ وہ اپنے حقیقی فرائض کو یکسر بھول چکا ہے۔

○ وہ مصائب کا شکار ہے، اس پر حیرانی اور سراسیمگی کا عالم طاری ہے۔ وہ یاس اور قنوطیت کی تصویر ہے۔ تنگ نظری، تعصب اور خود غرضی نے اسے یکسر اندھا بنا دیا ہے۔

○ مادی تمدن نے اسے جس خوفناک مقام پر لاکر کھڑا کیا ہے۔ وہاں اسے سخت وحشت محسوس ہوتی ہے۔ اسے اپنے آپ سے اس مادی تمدن سے، اس کے نظم اجتماعی سے، اس کے اخلاقی ضوابط سے اور اس کے افکار و نظریات سے خوف محسوس ہوتا ہے۔

○ انسان آوارہ و سرگرداں ہے۔ غم و اندوہ نے اسے نڈھال کر دیا ہے۔ اس کے جسم اور اعصاب کو تھکا دیا ہے۔ وہ پریشان خیال، یاس و قنوطیت کا شکار ہے اور اپنے اس غم کو شراب اور اس طرح کے دوسرے مخدرات کو استعمال کر کے وقتی طور پر بھلانے کی کوشش کرتا ہے۔

○ یورپ اور امریکہ سے اس نوعیت کی اندوہناک خبریں بھی وقتاً فوقتاً ہم تک پہنچتی رہتی ہیں کہ مادی اشیاء اور سامان کے ساتھ حد سے بڑھی ہوئی محبت رکھنے والے بے حس انسان بعض اوقات سرد کار آلات کے بدلے اپنے بچوں تک کو رہن رکھنے اور بیچنے تک کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

جب ہمارے سامنے یہ روح فرسا صورت حال آتی ہے جسے جدید علمی انکشافات نے روح کے تقاضوں سے بے نیاز ہونے کی وجہ سے جنم دیا ہے تو ہمارے دل میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس معمولی آرام و آسائش کی کوئی قدر و منزلت باقی نہیں رہتی۔ جو مادی تہذیب نے انسان کے لیے فراہم کی ہے۔ جب ہم اس تہذیب کے لائے ہوئے مصائب کو دیکھتے ہیں، اس کی مایوسیوں اور ناکامیوں کا جائزہ لیتے ہیں، ان بنیادی خرابیوں کا کھوج لگاتے ہیں جو اسے گھن کی طرح اندر ہی اندر سے کھا رہی ہیں۔ تو ہماری نظروں میں اس تہذیب کی وقعت اس کے علمی کمالات کی وقعت خود بخود کم ہو جاتی ہے اور اس کے مقابلے میں اس تہذیب کی عظمت بڑھ جاتی ہے جس کی بنیاد انسانی عزو شرف، بلند اور پاکیزہ مقاصد پر رکھی گئی ہے اور جو انسان کو خالق کائنات کے منشا و مرضی کے مطابق عقل، علم، تجربے اور مشاہدے سے فائدہ اٹھانے کی تربیت دیتی اور اس کے فطری داعیات کی تسکین کا سامان فراہم کرتی ہے۔

سفید فام انسان خواہ وہ روسی ہو یا امریکی انگریز ہو یا فرانسیسی اس کا دور عروج اب ختم ہو چکا ہے۔ اس کے زوال کی تہہ میں دین و دنیا کی تفریق بحیثیت ایک زبردست محرک کارفرما ہے۔ یہ تفریق یورپ کی پوری تاریخ میں، اس کے افکار و نظریات میں، اس کے نظم اجتماعی اور ان اساسی تصورات میں جلوہ گر ہے جن پر کہ موجودہ یورپ کی تہذیب قائم ہے۔ مغرب کے سفید فام انسان کے زوال کے ساتھ ساتھ اس غلط انداز فکر کا بھی خاتمہ ہونے کو ہے۔

حیات انسانی کی تعمیر نو کے لیے اب جن نئے نظریات، جن نئے افکار و تصورات اور نئے اصولوں کی ضرورت درپیش ہے انہیں سب سے پہلے کائنات کی تخلیق کا صحیح مقصد، انسان کا اس میں مرتبہ و مقام اور اس کے مقاصد کو متعین کرنا ہوگا۔ یہ سب بنیادی مسائل طے کیے بغیر وہ کسی اچھی اور پائیدار زندگی کی تعمیر نہیں کر سکتے۔ ان سب کا ہمیں تعصب اور تنگ نظری اور نفسانی خواہشات کے اثرات کے تحت جائزہ لینے کی بجائے حقیقت پسندی سے جائزہ لینا چاہیے۔ یہ اس دور کی ایک اساسی اور بنیادی ضرورت ہے۔

مغرب کے سفید فام نے اسی جائزے میں غفلت اور کوتاہی سے کام لیا اور پھر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حماقت سے اس غلط اور نامکمل جائزے کی بنیاد پر مشرق ومغرب میں ایک ناقص نظمِ اجتماعی کا تسلط قائم کرنے کی کوشش کی۔

انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے ایک ذی روح ہستی ہے۔ اس بنا پر وہ ایک ایسے عقیدے کا محتاج ہے جو اس کے احساسات وافکار کا منبع ومخزن ہو۔ جو اس کی زندگی اور اس کے گرد پھیلی ہوئی وسیع وعریض کائنات کے مقصدِ وجود کو اس پر آشکارا کرے اور اسے بتائے کہ اس کا اس کائنات سے کیا رشتہ ہے۔ اس کے دل میں ایک ایسے ارفع واعلیٰ نصب العین کی محبت جاگزیں کرے جس سے سرشار ہو کر وہ اپنی ذات اور اپنی نسل اور قوم کے مادی مفادات سے بلند ہو کر انسانیت کے وسیع تر مفادات کے بارے میں سوچے اور پھر ان کے حصول کے لیے تگ ودو کرے۔ پھر یہ طرزِ فکر اسے حق تعالیٰ کے ساتھ رشتۂ عبودیت استوار کرنے میں بھی مدد دے اور اس کے اندر یہ تحریک پیدا کرے کہ وہ اس ذات بے ہمتا کی محبت اور خوف اور اسی کی رضاجوئی کے لیے سرگرمِ عمل ہو۔ اس چشمۂ خیر سے ہر آن بھلائی کا طلب گار ہو اور برائی سے دامن کش رہے اور دنیا میں جو کام بھی کرے اس میں اس کے پیشِ نظر صرف یہ بات ہو کہ اسے ایک دن عادلِ کامل ذات کی بارگاہ میں پیش ہونا ہے۔ اور شر کے خلاف صف آرا اور اس سے برد آزما ہونے میں اسے جو نقصانات اٹھانے پڑیں گے، وہ ذاتِ برحق ان کی پوری طرح تلافی کر دے گی۔

یہ عقیدہ جس طرح عبادتِ الٰہی کی جان ہے۔ اسی طرح اسے انسانی افکار واعمال کی اساس بھی ہونا چاہیے۔ اسی عقیدے کے ہمہ گیر تصرف سے حیاتِ انسانی کی فطری وحدت قائم ہو سکتی ہے اور اس کے مختلف گوشوں کے درمیان —— نزاع اور تصادم کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض اوقات انسانی جسم کی احتیاجات اور ضروریات انسان کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرا لیتی ہیں اور وہ ان کی تسکین وتکمیل کے لیے مختلف اقسام کے مادی سامان فراہم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے کس طرح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انکار کیا جا سکتا ہے کہ صرف ان مادی احتیاجات کی تسکین سے پوری زندگی سکون اور آرام سے لذت آشنا نہیں ہو سکتی اور انہیں پورا کرنے کے باوجود اس کے اندر ایک زبردست اضطراب موجود رہتا ہے۔ اس اضطراب کو کھانے اور پہننے کا عمدہ سے عمدہ سامان، اچھے سے اچھا لباس اور آرام دہ مکان اور اس کا ساز و سامان سکون سے نہیں بدل سکتا۔ یہ احتیاج کی ایک دوسری ہی نوعیت ہے جس کی تکمیل بجز ایمان کی حلاوت سے اور کسی دوسری چیز سے نہیں ہو سکتی۔

یہ احتیاج مادی احتیاجات سے کہیں زیادہ شدید ہوتی ہے۔ اس کا وجود عالم محسوسات اور اس کے مختلف مظاہر سے کہیں زیادہ حقیقی ہوتا ہے۔ اس احتیاج کو انسان عملی زندگی میں اسی طرح محسوس کرتا ہے جس طرح کہ اپنے ضمیر کی گہرائیوں میں اور جس کے زیر اثر اگر وہ یہ آرزو کرتا ہے کہ اس کی زندگی کی تعمیر بھی اسی عقیدے کے مطابق کی جائے جو اس کی روح کی تسکین اور اس کی دینی اور مذہبی زندگی کی تعمیر کے لیے ضروری ہے جو اس کی انفرادی زندگی، اجتماعی زندگی اور نظم کائنات میں ہم آہنگی پیدا کرے۔ درحقیقت انسان کا ضمیر ایک ایسے خالق و مالک پر ایمان و ایقان کے لیے مضطرب رہتا ہے جو اس کی ذات اور اس کی اجتماعی زندگی دونوں کو بیک وقت ایک ہی نور سے منور کر دے۔

زندگی کے متفرق اور متعدد تقاضوں کے درمیان جب تک ایک بنیادی اور اساسی تصور، معنوی ربط اور مقصدی ترتیب پیدا کر کے انہیں ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں کرتے۔ اس وقت تک انسانیت کی فلاح و کامرانی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا اور اسی پہلو سے سفید آدمی کا تمدن سب سے زیادہ ناکام و نامراد ہے اور اسی وجہ سے یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ سفید فام انسان کا دورِ اقتدار اب ختم ہو گیا ہے۔

© rasailojaraid.com